© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر[1]

جواب آں غزل در 'اسلام اور ریاست؛ ایک جوابی بیانیہ'

روزنامہ جنگ ۲۲ جنوری، ۲۰۱۵ء کے ادارتی صفحات پر ٹی وی اسکالر جناب جاوید احمد غامدی کا ایک کالم 'اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کالم کے جواب میں اصحابِ علم وفضل کی بہت سی تحریریں روزنامہ جنگ اور دیگر اخبارات کے صفحات پر شائع ہوئیں۔ مولانا تقی عثمانی صاحب نے بھی روزنامہ جنگ میں اُن کے مضمون کے مرکزی خیال کا خوب ناقدانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ اُن کے جائزے کو آگے بڑھاتے ہوئے زیر نظر تحریر میں ہماری یہ کوشش ہوگی کہ ہم جناب غامدی کے مجموعی فکر کے تناظر میں ان کے کالم کے مختلف حصّوں کو سامنے رکھ کر ایک تجزیہ پیش کریں اور اُن کے موقف کی دیگر اُلجھنوں کو بھی واضح کریں :

① محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

> "اس وقت جو صورتِ حال بعض انتہا پسند تنظیموں نے اپنے اقدامات سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے پوری دنیا میں پیدا کر دی ہے، یہ اُسی فکر کا نتیجہ ہے جو ہمارے مذہبی مدرسوں میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے، اور جس کی تبلیغ اسلامی تحریکیں اور مذہبی سیاسی جماعتیں شب وروز کرتی ہیں۔"

ہمیں اور نہ ہی اہل مدرسہ کو انتہا پسند تنظیموں کے اَفکار واعمال سے اتفاق ہے جبکہ غامدی صاحب کا یہ بیان مدارسِ دینیہ، اسلامی تحریکوں اور مذہبی سیاسی جماعتوں پر ایک الزام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خود غامدی صاحب جو مدرسہ کے نظام ونصاب سے نہیں گزرے، وہ یہ کیسے طے کر سکتے ہیں کہ مدارسِ اسلامیہ میں وہ سب کچھ پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے جو تحریکِ طالبان پاکستان یا القاعدہ کے افکار و نظریات ہیں۔ غامدی صاحب کا یہ دعویٰ اسی طرح کا ہے جو مدرسے کا ایک فارغ التحصیل پاکستانی یونیورسٹیوں

۱ اسسٹنٹ پروفیسر، کامساٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور
ای میل: mzubair@ciitlahore.edu.pk، فیس بک: Hm Zubair

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

کے بارے یہ کہہ کر کرے کہ یہاں تو الحاد پڑھایا جاتا ہے۔ اگر مدارسِ دینیہ اور اسلامی تحریکوں میں یہ سب کچھ پڑھایا جاتا ہوتا تو یہ عملی انتہاپسندی آپ کو ایّوب، بھٹو اور ضیاء الحق کے اَدوار میں بھی نظر آتی۔ پاکستان میں انتہاپسند عناصر ان تحریکوں کی کوکھ سے برآمد ہوئے جنھیں امریکہ نے پاکستانی آمروں کے تعاون سے روس کے خلاف کھڑا کیا۔ پس عملی انتہاپسندی کے مسئلے کا حل دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی یا اسلامی تحریکوں کے افکار پر پابندی سے کسی صورت حاصل نہ ہو گا کیونکہ یہ اس کی اصل وجہ ہے ہی نہیں۔ اگر ہم ملک پاکستان کو انتہاپسند عناصر کے چنگل سے نکالنے میں سنجیدہ ہیں تو ہمیں وہ وجوہات ختم کرنا ہوں گی جو امر واقعی میں انتہاپسندوں کے کارخانے قائم کیے چلی جارہی ہیں۔ اور انتہاپسند عناصر کے کارخانے لگنے کی وجوہات میں سب سے اہم وجہ ۱۹۸۰ء سے جنوبی ایشیا میں امریکی پالیسی اور فورسز کی اپنے مفادات کے تحفظ اور فروغ کے لیے موجودگی اور ہمارا بحیثیتِ قوم اُنہیں خوش آمدید کہنا اور اُن کے ہاتھوں کبھی جہاد اور کبھی امن کے نام پر استعمال ہونا ہے۔

④ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

> "اس کے بالمقابل اسلام کا صحیح فکر کیا ہے؟ یہ در حقیقت ایک جوابی بیانیہ ہے اور ہم نے بارہا کہا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں مذہب کی بنیاد پر فساد پیدا کر دیا جائے تو سیکولرازم کی تبلیغ نہیں، بلکہ مذہبی فکر کا ایک جوابی بیانیہ ہی صورتِ حال کی اصلاح کر سکتا ہے۔"

یہ بات تو درست ہے کہ جب معاشرے میں اسلام کے نام پر فساد پیدا کر دیا جائے تو اس کا جواب 'سیکولرازم کی تبلیغ' نہیں ہے بلکہ فساد برپا کرنے والی مذہبی فکر کا جوابی بیانیہ تیار کرنا ہے۔ پس کسی معاشرے کے لیے یہ صحت مند رویہ نہیں ہے کہ انتہاپسندوں کے فکر یا ان کی کاروائیوں کے ردِّ عمل میں دین اسلام ہی سے اس لیے بیزار ہو جائے کہ وہ اس قسم کی فکر یا کاروائیوں کے لیے اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں بلکہ صحیح رویہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ یہ اسلامی فکر اور دینی عمل نہیں ہے، اور علمی بنیادوں پر اسلامی موقف کی وضاحت و تبلیغ کی جائے۔ دیگر اصحابِ علم و فضل کا کہنا یہ ہے، کہ امر ضرور محل نظر ہے کہ جناب غامدی صاحب نے جو 'جوابی بیانیہ' تیار کیا ہے، اُسے بھی 'سیکولرازم کی تبلیغ' میں ہی رکھا جائے یا وہ امر واقعی میں اس سے ہٹ کر ایک 'جوابی بیانیہ' ہے۔ اس بات میں کافی وزن ہے کہ غامدی صاحب سیکولرازم کی ظاہری مخالفت کر کے اور عملاً ریاست کا مذہب سے کوئی سروکار نہ رکھنے کا کہہ کر دراصل سیکولرازم کی ہی تلقین کر رہے ہیں، جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے۔

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

③ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''لہٰذا یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے اور اس کو بھی کسی قراردادِ مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔''

غامدی صاحب کی یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ بات ریاست کی تعریف ہی کے خلاف ہے۔ ریاست کے ارکان(Pillars) میں علاقہ(Territory) ، آبادی(Population) ، حکومت (Government)کے علاوہ اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) بھی شامل ہے جبکہ حکومت کے ارکان میں پارلیمنٹ، عدلیہ اور انتظامیہ شامل ہے اور اب بعض ماہرین سیاسات میڈیا کو بھی اس کا ایک رکن قرار دیتے ہیں۔ پس علم سیاسیات(Political science) میں ریاست کا کوئی ایسا تصور موجود نہیں ہے کہ جس میں اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) کو اس سے علیحدہ کیا جا سکے۔ مانا کہ ریاست اور حکومت میں فرق ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا لیکن اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) کو طے کیے بغیر کوئی ریاست، ریاست کہلانے کی مستحق بھی نہیں ہے۔ اور مسلمانوں کی ایک ریاست میں یہ مقتدرِ اعلیٰ (Sovereign) اور مختارِ اعلیٰ (Supreme Authority) کتاب وسنت کے علاوہ کسے بنایا جاسکتا ہے؟[1]

④ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہ اپنی ایک ریاست ہائے متحدہ قائم کر لیں۔ یہ ہم میں سے ہر شخص کا خواب ہو سکتا ہے اور ہم اس کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی جدوجہد بھی کر سکتے ہیں، لیکن اس خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ یہ اسلامی شریعت کا کوئی حکم ہے جس کی خلاف ورزی سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔''

---

1 فاضل مقالہ نگار نے ریاست کی تعریف کرتے ہوئے اس کے بنیادی ارکان میں علاقہ، آبادی اور نظامِ حکومت کے ساتھ اقتدارِ اعلیٰ کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ جدید مغربی ریاست کے لازمی ارکان ہیں جبکہ اسلامی نظریاتی تصورِ ریاست میں ایک نظامِ اتباع یا اقتدارِ اعلیٰ ریاست کا اوّلین تقاضا ہے، سو نبی کریم ﷺ کی یہ ریاست چند پیروکاروں کے ساتھ مکہ مکرمہ میں بھی قائم تھی، اور اسلامی ریاست کا وجود مدینہ منورہ سے قبل مکہ مکرمہ میں بھی تھا۔ اس میں اہم ترین عنصر نظامِ اتباع ہی ہے، جو ظاہر ہے کہ اللہ کا قرآن اور نبی کا فرمان ہی تھا۔ اس سلسلے میں وکی پیڈیا میں Nor Fadzlina Nawi کا مقالہ Islamic State اور ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب رسول ﷺ کی حکمرانی و جانشینی: ص ۱۵ و مابعد کا مطالعہ مفید ہو گا۔ ح م

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

غامدی صاحب کی یہ بات درست نہیں ہے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے: «إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَيْنِ فَاقْتُلُوا الْآخَرَ مِنْهُمَا» کہ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو دوسرے کو قتل کر دو۔ ہم یہ وضاحت کرتے چلیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا دوسرے خلیفہ کو قتل کرنے کا حکم اس صورت میں ہے جبکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کا خلیفہ ایک ہی ہو جیسا کہ شروعِ اسلام میں مسلمانوں کی ایک ہی اجتماعیت تھی۔ اب جبکہ مسلمان چھوٹی چھوٹی پچاس سے زائد ریاستوں میں تقسیم ہو چکے تو اس حدیث کے مقصد پر عمل کی طرف اُمت کو راغب کیا جائے گا اور وہ مقصد ہے مسلمانوں کی عالمی اجتماعیت کا قیام۔ پس موجودہ اسلامی ریاستوں کو ایک 'اسلامی ریاست ہائے متحدہ' کے قیام کی طرف پیش رفت کرنی چاہیے، یہ ایک دینی حکم ہے۔ اگر یہ دینی حکم نہ ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ مسلمانوں کی اجتماعیت کو تقسیم کرنے پر قتل کا حکم جاری کیوں فرماتے؟ اسی طرح اگر 'ریاست ہائے متحدہ امریکہ' کا وجود میں آنا ان ریاستوں کے لیے سیاسی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے مفید ہو سکتا ہے تو 'اسلامی ریاست ہائے متحدہ' کے مسلم اُمت کے لیے ان کے اجتماعی پہلوؤں سے مفید ہونے میں کیا بحث ہو سکتی ہے؟ اور کیا ہمارا دین جو ایک فرد کے ذاتی اور جزوی فائدے کا بھی لحاظ کرتے ہوئے احکام جاری کرتا ہے، اس دین میں اس چیز کا حکم ہی نہ ہو گا کہ جس میں پوری اُمت کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مفادات موجود ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ تعبیر بہت ہی قابلِ تعجب ہے۔[1]

⑤ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"پہلی صدی ہجری کے بعد ہی، جب مسلمانوں کے جلیل القدر فقہا، اُن کے درمیان موجود تھے، ان کی دو سلطنتیں، دولتِ عباسیہ بغداد اور دولتِ اُمویہ اندلس کے نام پر قائم ہو چکی تھیں اور کئی صدیوں تک قائم رہیں، مگر ان میں سے کسی نے اسے اسلامی شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا۔"

اس بارے ہمارا کہنا یہ ہے کہ ایک ہے امر واقعی اور ایک امر شرعی۔ امر شرعی تو یہی ہے کہ مسلمانوں کو اللہ کے رسول ﷺ نے اس حال میں چھوڑا کہ اُنہیں اپنے بعد ایک ہی خلیفہ مقرر کرنے

1 نبی کریم ﷺ نے اُمتِ اسلامیہ کو ایک جسدِ واحد اور مضبوط عمارت قرار دیا ہے اور اُنہیں اسی کی تلقین کی ہے، نیز خلافتِ راشدہ نے رہتی دنیا تک ملتِ اسلامیہ کے لیے اسی کی عملی اور قابل اتباع مثال پیش کی تھی۔ ح م

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

اور صرف اسی کی بیعت کرنے کا حکم جاری کیا، جیسا کہ اوپر روایت گزر چکی۔ امر واقعی یہ ہے کہ مسلمان اُمت تفرقے میں پڑ کر تقسیم ہو گئی۔ عراق میں بنو عباس، مصر میں فاطمی اور اندلس میں اُموی حکومت قائم ہوئی۔ فقہا نے اس تقسیم کے قائم ہو جانے کے بعد اُمت کے لیے اپنے علاقوں کے مسلمان حکمرانوں کی اطاعت کو ترجیح دی لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا کہ وہ اُمت کے بٹ جانے کو شرعی بھی سمجھتے تھے۔ فقہا کیسے اس تقسیم پر راضی ہو سکتے تھے جبکہ وہ جانتے تھے کہ یہ مسلمانوں میں باہمی جنگ وجدال اور قتل وغارت گری کی بنیاد ہے۔ اور بنو عباس اور بنو اُمیہ، عباسی اور فاطمی دشمنی اور قتل وغارت گری کی داستانیں کس پر واضح نہیں ہیں؟ اور مسلمانوں کی اسی باہمی قتل وغارت گری کے نتیجے میں ہی تو بنو اُمیہ کی حکومت قائم ہوئی ہے اور دیگر حکومتیں بھی اسی طرح سے قائم ہوئی ہیں۔ کیا یہ کہنا کوئی مناسب بات ہو گی کہ اسلام باہمی قتل وغارت گری کے ذریعے مسلم اُمت کی تقسیم کو جائز قرار دیتا ہے۔ اگر نہیں تو پھر غامدی صاحب کو تاریخ کے صفحات سے یہ واضح کرنا چاہیے تھا کہ بنو عباس اور بنو امیہ اور اس کے بعد بھی مسلمانوں کی یہ تقسیم کسی باہمی صلح وصفائی کا نتیجہ تھی۔

اندلسی فقیہ اور مجتہد امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب 'مراتب الاجماع' میں لکھتے ہیں:

وَاتَّفَقُوا أنه لَا يجوز أَن يكون على الْمُسلمين فِي وَقت وَاحِد فِي جَمِيع الدُّنْيَا إمامان لَا متفقان وَلَا مفترقان وَلَا فِي مكانين وَلَا فِي مَكَان وَاحِد

"اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ جائز نہیں کہ مسلمانوں کے ایک ہی وقت میں پوری دنیا میں دو خلیفہ ہوں، چاہے وہ آپس میں متفق ہوں، چاہے اختلاف کرنے والے ہوں، چاہے دو مختلف علاقوں میں ہوں، چاہے ایک ہی علاقہ میں ہوں۔"

اسی طرح امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب 'السنن الکبریٰ' میں باقاعدہ باب لايصلح إمامان في عصر واحد (ایک ہی وقت میں دو مسلمان خلفا کا ہونا جائز نہیں ہے) کے نام سے باب باندھ کر اس کے ذیل میں متعدد احادیث نقل کرتے ہیں۔

⑥ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔"

خلیفہ سے مراد "وہ مسلمان حکمران ہے جو اللہ کے بندوں کے مابین اللہ کے نازل کردہ احکامات کے

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

مطابق فیصلے کرے۔'' اللہ عزوجل سورۃ ص[آیت ۲۶] میں فرماتے ہیں: ﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ ''اے داود علیہ السلام ! بے شک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے تا کہ آپ لوگوں کے مابین حق کے ساتھ فیصلے کریں۔ اور ان کی آرا و خواہشات کی پیروی مت کریں، یہ آپ کو اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔''

اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب مسند احمد میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

فَقَالَ حُذَيْفَةُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «تَكُونُ النُّبُوَّةُ فِيكُمْ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ تَكُونَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةٌ عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ تَكُونَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا عَاضًا، فَيَكُونُ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَكُونَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً، فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ تَكُونَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةً عَلَى مِنْهَاجِ نُبُوَّةٍ» ثُمَّ سَكَتَ (رقم ۱۸۴۰۶)

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: تمہارے درمیان نبوت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اللہ عزوجل چاہیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے، نبوت کو اُٹھا لیں گے۔ پھر نبوت کے منہاج پر خلافت قائم ہو گی، پس یہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ جب تک اللہ چاہیں گے، قائم رہے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے، اس خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو اُٹھا لیں گے۔ پھر کاٹ کھانے والی ملوکیت آئے گی اور یہ ملوکیت جب تک اللہ عزوجل چاہیں گے، باقی رہے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے، اس کاٹ کھانے والی ملوکیت کو بھی اُٹھا لیں گے۔ پھر جبری ملوکیت قائم ہو گی اور اللہ عزوجل جب تک چاہیں گے، یہ جبری ملوکیت قائم رہے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے، اس جبری ملوکیت کو اُٹھا لیں گے۔ اس کے بعد ایک بار پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو گی۔ اس کے بعد آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔''

البتہ اس میں اختلاف ممکن ہے کہ کاٹ کھانے والی اور جبری ملوکیت کے اَدوار کون سے ہیں؟ اور ان اَدوار کے بعد قائم ہونے والی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور کون سا ہے؟ لیکن اس میں کوئی شک وشبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ایک ایسا عادلانہ سیاسی نظام ہے کہ جو اللہ کے

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

رسول ﷺ اس اُمت کو دے کر گئے اور ظلم و جور کے نظام کے بعد ایک بار پھر اس کے آنے کی خوشخبری دے کر گئے۔

⑦ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"یہ بات سب نے کہی اور ہم بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا نظم اجتماعی اگر کسی جگہ قائم ہو جائے تو اس سے خروج ایک بدترین جرم ہے۔"

اہل السنۃ والجماعۃ کی عقیدے کی کتب میں یہی لکھا ہوا ہے اور یہی ائمہ وفقہائے دین کی رائے ہے کہ مسلمانوں کے 'نظم اجتماعی'[1] کے خلاف خروج جائز نہیں ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ اپنی کتاب 'العقیدۃ الطحاویۃ' میں فرماتے ہیں:

ولا نرى الخروج على أئمتنا وولاة أمورنا وإن جاروا، ولا ندعوا عليهم، ولا ننزع يدًا من طاعتهم، ونرٰى طاعتهم من طاعة الله عز وجل فريضة، ما لم يأمروا بمعصية، وندعوا لهم بالصلاح والمعافاة.

"اور ہم اپنے حکمرانوں اور اُمرا کے خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھتے، چاہے وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں۔ اور نہ ہم ان کے خلاف بددعا کرنے کے قائل ہیں۔ اور نہ ہی ہم ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچتے ہیں، اور ہم ان کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کی طرح فرض سمجھتے ہیں جب تک کہ وہ کسی معصیت کا حکم نہ دیں۔ اور ہم ان کے لیے اصلاح اور معافی کی دعا کرتے رہتے ہیں۔"

⑧ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں ہے، جس طرح کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں کسی جگہ یہ نہیں کہا گیا کہ مسلمان ایک قوم ہیں یا اُنہیں ایک قوم ہونا چاہیے، بلکہ یہ کہا گیا کہ ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ [مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں]۔ قرآن کی رو سے مسلمانوں کا باہمی رشتہ قومیت کا نہیں، بلکہ اخوت کا ہے۔ وہ دسیوں اقوام، ممالک اور

---

1 نظم اجتماعی کی اطاعت ضرور ہونی چاہیے، لیکن اس نظم اجتماعی کو اسلام کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے اور خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں جیسا کہ پہلے خلیفہ راشد سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مشہور اوّلین خطبہ ہے کہ "إنما أنا مُتبع، ولست بمبتدع، فإن أنا أحسنتُ فأعينوني، وإن زغت فقوموني" "میں کتاب وسنت کا پیروکار ہوں، نئی چیزیں لانے والا نہیں، اگر میں صحیح چلوں تو میری مدد کرنا، اگر گمراہ ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دینا۔" (موطا مالک: ۶۳۱)

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

ریاستوں میں تقسیم ہونے کے باوجود ایمان کے رشتے سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اس لئے یہ تقاضا تو ان سے کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیے کہ وہ اپنے بھائیوں کے حالات کی خبر رکھیں، ان کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں ان کے کام آئیں، وہ مظلوم ہوں تو ان کی مدد کریں، معاشی اور معاشرتی روابط کے لیے ان کو ترجیح دیں اور ان پر اپنے دروازے کسی حال میں بند نہ کریں، مگر یہ تقاضا نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی قومی ریاستوں اور قومی شناخت سے دست بردار ہو کر لازماً ایک ہی قوم اور ایک ریاست بن جائیں۔"

یہ بات تو درست ہے کہ مسلمانوں کو قرآن وحدیث میں کہیں بھی ایک قوم نہیں کہا گیا اور مسلمان ایمان کے رشتے کی بنیاد پر ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ نیز 'قومیں مذہب کی بنیاد پر نہیں بنتی'، یہ بات بھی درست ہے۔ قرآن مجید میں ہر نبی نے اپنے مخاطبین کو یا قوم کے خطاب سے اپنی قوم قرار دیا حالانکہ مخاطبین نبی کے دین پر نہیں تھے۔ اسی طرح قرآنِ مجید نے مشرکین مکہ کو اللہ کے نبی ﷺ کی قوم قرار دیا ہے۔ پس یہاں تک بات درست ہے کہ قومیں جغرافیائی حدود کی بنیاد پر وجود میں آتی ہیں۔ لیکن یہ ایسا کلمہ حق ہے جس کی مراد و مدعا سراسر باطل ہے کیونکہ اسلام میں قومیت کی بجائے 'اُمت' اور 'ملت' کا تصور ہے۔ اسلام پوری دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم نہیں بلکہ ایک 'اُمت' اور 'ملت' قرار دیتا ہے جیسا کہ پوری دنیا کے کافر ایک 'اُمت' یا 'ملت' ہیں، چاہے ان کی قومیں مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ[۱۴۳] میں ارشاد ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ "اور ہم نے تم کو ایک معتدل اُمت بنایا تاکہ تم لوگوں پر شہادت قائم کرو۔" ایک اور جگہ سورۃ آل عمران[۱۱۰] میں مسلمانوں کو 'خیر اُمت' کہا گیا ہے، وعلیٰ ہذا القیاس۔ اسی طرح قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب 'الآثار' میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں: «اَلْكُفْرُ كُلُّهُمْ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ» "عالم کفر سب کا سب ایک ہی ملت ہے۔" پس ایمان کے رشتے کی بنیاد پر مسلمانوں میں 'اخوت' بھی قائم ہوئی اور 'اُمّت وملت' بھی۔ 'اسلامی اخوت' کی اصطلاح میں مسلمانوں کی باہمی معاشرتی ضروریات کو پورا کرنے کا تصور ہے جبکہ 'اُمت مسلمہ' یا 'ملتِ اسلامیہ' کی اصطلاح میں 'سیاستِ شرعیہ' کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

⑨ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

"دنیا میں جو لوگ مسلمان ہیں، اپنے مسلمان ہونے کا اقرار، بلکہ اس پر اصرار کرتے ہیں، مگر کوئی ایسا عقیدہ یا عمل اختیار کر لیتے ہیں جسے کوئی عالم یا علما یا دوسرے تمام مسلمان صحیح نہیں سمجھتے، ان کے عقیدے یا عمل کو غلط قرار دیا جاسکتا ہے، اسے ضلالت اور گمراہی کہا جاسکتا ہے لیکن اس کے حاملین چونکہ قرآن وحدیث ہی سے استدلال کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے اُنہیں غیر مسلم یا کافر قرار نہیں دیا جاسکتا۔"

یہ مسئلہ بہت اہم ہے کہ جس پر غامدی صاحب نے کلام کیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ہمارے ہاں ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کی مشق نے اُمت کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور مولانا ابو الکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے بقول چودہ صدیوں میں ہم نے اتنے مسلمان نہیں بنائے جتنے ایک صدی میں فتووں سے کافر بنادیے ہیں۔ لیکن تکفیر کے اس فتنے کا حل یہ نہیں ہے کہ یہ بیانیہ تیار کیا جائے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعد کسی کو کافر قرار ہی نہیں دیا جاسکتا، چاہے وہ قرآن مجید سے اپنے مذہبی پیشوا کی نبوت ثابت کر لے، یا چاہے اُلوہیت، چاہے وہ کتابِ الٰہی سے ہمہ اوست ثابت کر دکھائے، چاہے ضروریاتِ دین اور ارکانِ اسلام کا ہی انکار کر دے۔ اس فتنے کا صحیح حل یہی ہے کہ عام مفتیوں اور علما کو قانوناً اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ تکفیر کے بارے کوئی فتویٰ جاری نہ کر سکیں۔ اور اسلامی نظریاتی کونسل کی طرح کا کوئی ایسا مضبوط و مستند ادارہ ہو کہ جس میں ملک بھر سے مختلف مکاتبِ فکر کے جید علما کی حقیقی نمائندگی ہو، اور جب تک کسی متعین شخص یا گروہ یا جماعت کی تکفیر پر ان نمائندہ علما کا اتفاق نہ ہو، اور یہ اہل علم ملک کی اعلیٰ عدالت مثلاً سپریم کورٹ کے شریعہ بنچ میں مخالف فریق پر اس کی غلطی واضح نہ کر دیں اور اس بارے اعلیٰ عدالت کا کوئی فیصلہ جاری نہ ہو جائے، اس وقت تک کسی کلمہ گو کی تکفیر قانوناً جرم قرار دی جائے۔ البتہ کسی کے کفر کو کفر اور شرک کو شرک قرار دینا، تو اس کی اجازت ہر صاحبِ علم کے لیے ہونی چاہیے جیسا کہ غامدی صاحب بھی اس بات سے متفق ہیں۔

⑩ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"علما کا حق ہے کہ ان کی غلطی اُن پر واضح کریں، اُنہیں صحیح بات کے قبول کرنے کی دعوت دیں، ان کے عقائد و نظریات میں کوئی چیز شرک ہے تو اسے شرک اور کفر کہیں اور لوگوں کو بھی اس پر متنبہ کریں، مگر ان کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ مسلمان نہیں رہے یا اُنہیں مسلمانوں

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

کی جماعت سے الگ کر دینا چاہیے، اس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے، اس لئے کہ یہ حق خدا ہی دے سکتا تھا اور قرآن وحدیث سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اس نے یہ حق کسی کو نہیں دیا ہے۔"

یہاں اصل میں دو چیزیں خلط ملط ہو رہی ہیں۔ ایک ہے، اہل علم کا کسی کے بارے فتویٰ جاری کرنا کہ وہ دین اسلام سے خارج ہو گیا ہے اور ایک ہے، کسی شخص کا اللہ کے ہاں کافر قرار پانا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ اگر اہل علم کی ایک جماعت کسی شخص کو دنیا میں کافر قرار دے گی تو ضروری نہیں ہے کہ وہ عند اللہ بھی کافر ہو کیونکہ یہ اہل علم کا اجتہاد ہے اور اجتہاد میں خطا کا پہلو بھی ہو سکتا ہے، اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اجتماعی اجتہاد میں خطا کا پہلو کم ہو جاتا ہے۔ پس اہل علم اگر کسی پر فتویٰ لگائیں گے تو وہ دنیا کے اعتبار سے ہو گا۔ اہل علم تو ظواہر پر ہی حکم لگاتے ہیں، اور سرائر کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور دنیا میں یہ فتویٰ 'سد الذرائع' کے اصول کے تحت لگایا جائے گا تا کہ دین کی حفاظت ہو۔ اور فتویٰ کا لفظ بھی 'فتوۃ' سے ہے کہ جس کے معنی 'نوجوانی' کے ہیں۔ پس جب کسی معاشرے میں عقیدے اور عمل کے رستے ایسا بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جس سے معاشرہ روحانی اور دینی طور پر اضمحلال کا شکار ہو جائے تو اس وقت 'فتویٰ' کے ذریعے اسے دوبارہ قوت مہیا کی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات درست ہے کہ فتویٰ کا ہمارے معاشروں میں غلط استعمال بڑھتا جا رہا ہے جسے روکنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن کسی شے کے غلط استعمال کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ نفس امر میں بھی وہ شے غلط ہے۔

⑪ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"شرک، کفر اور ارتداد یقیناً سنگین جرائم ہیں، لیکن ان کی سزا کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو نہیں دے سکتا، یہ خدا کا حق ہے۔"

شرک اور کفر کی حد تک تو بات درست ہے کہ اس کی سزا آخرت میں ہی ملے گی جیسا کہ سورۃ البقرۃ[۲۵۶] میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ "دین میں کسی قسم کا جبر نہیں ہے۔" پس کسی شخص کو مسلمان بننے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن 'ارتداد' ایک علیحدہ اصطلاح ہے۔ 'ارتداد' سے مراد کسی مسلمان کا دین اسلام سے پھر جانا ہے۔ دین اسلام، ارتداد کو اسلام سے ایک بغاوت قرار دیتا ہے، لہٰذا اس کی سزا قتل تجویز کرتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب 'صحیح بخاری' میں،

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

امام شافعی نے اپنی کتاب 'مسند الشافعی' میں اور امام احمد بن حنبل نے اپنی کتاب 'مسند احمد' میں اللہ کے رسول ﷺ کا مسلمانوں کے بارے یہ ارشاد نقل کیا ہے: «مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ» "جو اپنا دین تبدیل کر لے تو اسے قتل کر دو۔" امام مالک نے بھی اس مضمون کی روایت اپنی کتاب 'الموطا' میں ذکر کی ہے۔ البتہ فقہا نے یہ نقل کیا ہے کہ جو مسلمان دین اسلام سے پھر جائے گا، پہلے اسے قید کیا جائے گا اور کے اعتراضات اور شکوک وشبہات کو رفع کر کے اس پر حجت قائم کی جائے گی، اس کے بعد اس پر یہ سزا نافذ کی جائے گی۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اسے ریاست نے امان اسی کلمے کی بنیاد پر دی تھی کہ جس کلمے کی اطاعت کو اس نے اپنی گردن سے اتار پھینکا۔ اسی طرح چونکہ وہ ذمّی بھی نہیں ہے کہ اسے جزیہ کی وجہ سے امان حاصل ہوئی ہے، لہٰذا اس کا یہ عمل جب تک اسلامی ریاست کی حدود میں ہو تو اطاعت کے قلادے کو اُتار پھینکنے کی وجہ سے سراسر بغاوت پر مبنی عمل ہے۔

⑭ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"اس میں شبہ نہیں کہ جہاد اسلام کا حکم ہے۔ قرآن اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے کہ ان کے پاس طاقت ہو تو وہ ظلم وعدوان کے خلاف جنگ کریں۔ قرآن میں اس کی ہدایت اصلاً فتنہ کے استیصال کے لئے کی گئی ہے۔ اس کے معنی کسی شخص کو ظلم وجبر کے ساتھ اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں (Persecution) کہا جاتا ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ حکم ان کی انفرادی حیثیت میں نہیں، بلکہ بحیثیتِ جماعت دیا گیا ہے۔"

یہ درست ہے کہ جہاد کا مقصد ظلم وعدوان کا خاتمہ ہے۔ پس جہاد کا حکم لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے نہیں بلکہ ظلم وزیادتی کے خاتمے کے لیے ہے۔ لیکن ظلم سے مراد صرف وہی ظلم نہیں ہے کہ جو کسی شخص کو اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کے لیے کیا جائے بلکہ ظلم میں ہر قسم کا ظلم شامل ہے۔ خلفائے راشدین کے دور میں جس قدر اقدامی جہاد ہوا ہے مثلاً روم وفارس سے جو جہاد ہوا تو وہاں کون سے مسلمان موجود تھے کہ جن پر ہونے والے ظلم کے جواب میں یہ جہاد جاری کیا گیا۔ اس جہاد کا مقصد اس ظلم کا خاتمہ تھا جو اہل روم اور اہل فارس اپنی اقوام پر کر رہے تھے۔ امام ابن جریر طبری نے اپنی کتاب 'تاریخ الرسل والملوک' میں مسلمانوں کے سفیر عامر بن ربعی رضی اللہ عنہ کا ایرانی سپہ سالار

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com

رستم کے دربار میں جو مکالمہ نقل کیا ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے:

اللهُ ابْتَعَثَنَا، وَ اللهُ جَاءَ بِنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ الله، وَمِنْ ضِيقِ الدُّنْيَا إِلَى سِعَتِهَا، وَمِنْ جَوْرِ الأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الإِسْلام، فَأَرْسَلَنَا بِدِينِهِ إِلَى خَلْقِهِ لِنَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ، فَمَنْ قَبِلَ مِنَّا ذَلِكَ قَبِلْنَا ذَلِكَ مِنْهُ وَرَجَعْنَا عَنْهُ، وَتَرَكْنَاهُ وَأَرْضَهُ يَلِيهَا دُونَنَا، وَمَنْ أَبَى قَاتَلْنَاهُ أَبَدًا حَتَّى نُفْضِيَ إِلَى مَوْعُودِ الله

"اللہ نے ہمیں بھیجا ہے، اور اللہ ہمیں تمہارے پاس اس لیے لائے ہیں کہ ہم اللہ کے حکم سے اس کے بندوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں، اور اُنہیں دنیا کی تنگی سے اس کی کشادگی کی طرف لے جائیں، اور اُنہیں مذاہبِ عالم کے ظلم وجور سے نکال کر اسلام کے عدل میں داخل کردیں۔ پس اللہ عزوجل نے اپنا دین دے کر ہمیں اپنی مخلوق کی طرف بھیجا تاکہ ہم اُنہیں اللہ کی طرف دعوت دیں۔ پس جس نے یہ دعوت قبول کرلی تو ہم بھی اس کے اسلام کو قبول کریں گے اور یہاں سے واپس لوٹ جائیں گے۔ نہ صرف اُنہیں چھوڑ دیں گے بلکہ ان کی زمین بھی انہی کے پاس رہنے دیں گے۔ اور جس نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو ہم اس سے ہمیشہ کے لیے جنگ کریں گے یہاں تک کہ ہم اللہ کے وعدے کو پالیں۔"

پس اسلام میں جہاد کا مقصود صرف مسلمان پر ظلم کا خاتمہ نہیں بلکہ انسانوں پر سے ظلم کا خاتمہ ہے۔ اور دیگر ادیان ونظاموں کا نفاذ بھی ظلم کی ایک صورت[1] ہے۔ اور انسانوں پر سے ظلم کا یہ خاتمہ وہی مسلمان کرسکتے ہیں جو خود ظالم نہ ہوں۔

⑭ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"یہ بالکل قطعی ہے کہ جہاد صرف مقاتلین (Combatants) سے کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کا قانون یہی ہے کہ اگر کوئی زبان سے حملہ کرے گا تو اس کا جواب زبان سے دیا جائے گا، لڑنے والوں کی مالی مدد کرے گا تو اس کو مدد سے روکا جائے گا، لیکن جب تک وہ ہتھیار اُٹھا کر لڑنے کے لیے نہیں نکلتا، اس کی جان نہیں لی جاسکتی۔ یہاں تک کہ عین میدانِ جنگ میں بھی وہ اگر

---

۱ مذکورہ فرمان میں مذاہب عالم کے ظلم وجور کے علاوہ درج ذیل فرمانِ نبویؐ بھی اس پر شاہد ہے:
«مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ العُلْيَا، فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ» (صحیح بخاری: ۱۲۳)
البداية والنهاية: 22/117

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

ہتھیار پھینک دے تو اسے قیدی بنایا جائے گا، اس کے بعد اُسے قتل نہیں کیا جاسکتا۔"

یہ بات درست ہے کہ جہاد صرف مقاتلین سے ہی ہو گا لیکن مقاتلین کی جو تعریف غامدی صاحب نے بیان کی ہے، وہ قابل نظر ہے۔ مقاتلین صرف ہتھیار اُٹھانے والے نہیں ہوتے بلکہ مقاتلین سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ میں شریک ہوں، چاہے ہتھیار اُٹھا کر، چاہے ہتھیار چلا کر۔ آج کل کی صورتِ حال میں کسی بھی ملک کی سیکورٹی فورسز، آرمی، نیوی اور فضائیہ میں ہتھیار چلانے والے یا دو بدو لڑنے والے تو کم ہی ہوتے ہیں، باقی ایک بڑی تعداد تو اُن کے معاونین کی ہوتی ہے۔

⑭ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"دورِ حاضر کے مغربی مفکرین سے صدیوں پہلے قرآن نے اعلان کیا تھا کہ ﴿أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ "مسلمانوں کا نظم اجتماعی اُن کے باہمی مشورے پر مبنی ہو گا۔" اس کے صاف معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی حکومت ان کے مشورے سے قائم ہو گی۔ نظام مشورے ہی سے وجود میں آئے گا۔ مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں گے۔"

مسلمانوں کی حکومت میں مشورے کی اہمیت سے انکار نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ منصوص مسائل میں مشورہ نہیں بلکہ ان کے نفاذ کی تدبیر میں مشورہ ہو گا۔ اسی طرح مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں گے تو اس میں بھی تفصیل یہ ہے کہ مسئلہ کی نوعیت کو دیکھیں گے۔ اگر تو مسئلہ قومی ہے تو قوم سے مشورہ لیا جائے اور اگر علمی ہے تو اہل علم سے مشورہ کیا جائے اور فنی ہے تو اہل فن سے مشورہ لیا جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بدر، اُحد اور خندق کی جنگوں میں عام مشورہ لیا کیونکہ مسئلہ قومی تھا کہ قوم نے ہی لڑنا تھا لہٰذا اسی سے مشورہ کیا گیا۔

⑮ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"جدید ریاست میں پارلیمان کا ادارہ اسی مقصد سے قائم کیا جاتا ہے۔ ریاست کے نظام میں آخری فیصلہ اسی کا ہے اور اس کا ہونا چاہیے۔ علما ہوں یا ریاست کی عدلیہ، پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔"

ریاست میں پارلیمان کے ادارے کو 'شوریٰ' بنالیں، لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ریاست کے نظام میں آخری سند پارلیمان ہے۔ اسلامی ریاست کے نظام میں آخری سند (سپریم اتھارٹی) کتاب و سنت

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

ہیں جو تمام شہریوں کے دنیوی و دینی جملہ حقوق کی ادائیگی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ پارلیمان کو بھی یہ ثابت کرنا ہو گا کہ نظام کی جو تعبیر اور صورت وہ پیش کر رہی ہے، وہ ظلم وزیادتی پر مبنی نہیں ہے۔ اور اگر پارلیمان کی کسی تعبیر سے شہریوں کے دنیوی یا دینی حقوق متاثر ہوں گے، تو اُنہیں اعلیٰ عدلیہ کی طرف رجوع کرنے کا حق حاصل ہو گا۔ اب اعلیٰ عدلیہ اس بارے فیصلہ کرے گی کہ پارلیمان کا وضع کیا گیا نظام کہیں کتاب وسنت کے منافی تو نہیں ہے؟ اگر اعلیٰ عدلیہ یہ فیصلہ کر دے کہ پارلیمان کا وضع کردہ نظام کتاب وسنت کے منافی نہیں ہے تو اس کا فیصلہ ہر دو فریق پر لاگو ہو گا۔

⑯ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے، اس سے ہٹ کر جو حکومت قائم کی جائے گی، وہ ایک ناجائز حکومت ہو گی، خواہ اس کے سربراہ کی پیشانی پر سجدوں کے نشان ہوں یا اسے امیر المؤمنین کے لقب سے نواز دیا جائے۔"

ہمارا مشورہ یہ ہے کہ غامدی صاحب کو اپنی رائے میں عاجز ہونا چاہیے۔ اگر وہ بھی فتویٰ کی زبان اور ترش اسلوب میں بات کرنا شروع کر دیں گے تو پھر اُنہیں اپنے ناقدین سے اسی قسم کے اُسلوبِ بیان کا شکوہ رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہو گا۔ سوسائٹی میں علمی مکالمہ ہونا چاہیے لیکن اس قسم کے الفاظ علمی مکالمہ کی بجائے ردعمل کی نفسیات کو جنم دیتے ہیں۔

⑰ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی حکومت اگر کسی جگہ قائم ہو تو اس سے بالعموم نفاذِ شریعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ یہ تعبیر مغالطہ انگیز ہے، اس لئے کہ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں حکومت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ شریعت کے تمام احکام ریاست کی طاقت سے لوگوں پر نافذ کر دے حالانکہ قرآن وحدیث میں یہ حق کسی حکومت کے لئے بھی ثابت نہیں ہے۔ اسلامی شریعت میں دو طرح کے احکام ہیں، ایک جو فرد کو بحیثیتِ فرد دیے گئے ہیں، اور دوسرے جو مسلمانوں کے معاشرے کو دیے گئے ہیں، پہلی قسم کے احکام خدا اور بندے کے درمیان ہیں اور وہ اس میں کسی حکومت کے سامنے نہیں بلکہ اپنے پروردگار ہی کے سامنے جواب دہ ہے۔ لہٰذا دنیا کی کوئی حکومت اسے مثال کے طور پر، روزہ رکھنے یا حج عمرہ کے لئے جانے یا ختنہ کرانے

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com

یا مونچھیں پست رکھنے اور وہ اگر عورت ہے تو سینہ ڈھانپنے، زیب وزینت کی نمائش نہ کرنے یا اسکارف اوڑھ کر باہر نکلنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتی۔ اس طرح کے معاملات میں تعلیم وتربیت اور تلقین ونصیحت سے آگے اس کے کوئی اختیارات نہیں ہیں، اِلا یہ کہ کسی کی حق تلفی یا جان، مال وآبرو کے خلاف زیادتی کا اندیشہ نہ ہو۔ قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ دین کے ایجابی احکام میں سے یہ صرف نماز اور زکوٰۃ ہے جس کا مطالبہ مسلمانوں کا کوئی نظم اجتماعی اگر چاہے تو قانون کی طاقت سے کر سکتا ہے۔ رہے دوسری قسم کے احکام تو وہ درحقیقت دیے ہی حکومت کو گئے ہیں۔ اس لئے کہ اجتماعی معاملات میں وہی معاشرے کی نمائندگی کرتی ہے۔ علماء اربابِ حل وعقد سے ان پر عمل کا مطالبہ کریں تو یقیناً حق بجانب ہوں گے اور اپنے منصب کے لحاظ سے ان کو کرنا بھی چاہیے۔ مگر یہ شریعت پر عمل کی دعوت ہے، نفاذِ شریعت کی تعبیر اس کے لئے بھی موزوں قرار نہیں دی جا سکتی۔"

غامدی صاحب نے دینی احکام کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی قسم کے بارے ان کا کہنا یہ ہے کہ ان احکامات میں بندہ صرف اپنے پرودگار کو جواب دہ ہے، الا یہ کہ کسی کی حق تلفی یا جان ومال یا آبرو کے خلاف زیادتی ہو۔ لیکن اس میں ایک ضروری اضافے کے بغیر ان کی بات نامکمل ہے اور وہ اضافہ یہ ہے کہ اگر کسی فرد کے عمل سے معاشرے میں فتنہ اور فساد کی راہ کھلے گی تو اسے قانوناً روکا جائے گا۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر حکومت ایک عورت کو سینہ ڈھانپنے یا اسکارف پہننے لیے مجبور نہیں کر سکتی ہے تو کیا حکومت اس کے بے لباس (nude) ہو کر مقامی مقامات پر گھومنے پھرنے کی صورت میں بھی صرف وعظ ونصیحت پر اکتفا کرے گی؟ اور اس صورت میں کسی کی کیا حق تلفی ہوتی ہے یا جان ومال کو نقصان پہنچتا ہے؟ پس صحیح موقف یہ ہے کہ حکومت ہر ایسے کام سے روکے گی اور اسے روکنا بھی چاہیے کہ جو معاشرے میں کسی بھی قسم کے دینی، اخلاقی یا روحانی بگاڑ کا سبب بنے۔ سورۃ الحج: ۴۱ میں مذکور مسلم حکومت کے فرائض میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے تقاضے اسے پورے کرنا ہوں گے۔

⑱ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"نمازِ جمعہ اور نمازِ عیدین کا اہتمام حکومت کرے گی۔ یہ نمازیں صرف انہی مقامات پر ادا کی جائیں گی جو حکومت کی طرف سے ان کے لئے مقرر کر دیئے جائیں گے۔ ان کا منبر حکمرانوں

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

کے لئے خاص ہو گا۔ وہ خود ان نمازوں کا خطبہ دیں گے اور ان کی امامت کریں گے یا ان کی طرف سے ان کا کوئی نمائندہ یہ ذمہ داری ادا کرے گا۔ ریاست کی حدود میں کوئی شخص اپنے طور پر ان نمازوں کا اہتمام نہیں کر سکے گا۔"

حکمران ضرور نماز پڑھائیں لیکن بات یہ ہے کہ وہ علمی، اخلاقی اور روحانی طور پر اپنے آپ کو اس کا اہل بھی تو ثابت کریں ناں۔ اگر موجودہ صورتِ حال میں اس تجویز پر عمل کر لیا جائے تو دین چھوڑ معاشرہ بھی ایک تماشہ بن جائے گا۔ اب اگر جناب زرداری صاحب دارالعلوم کراچی میں عید کی نماز پڑھائیں اور مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب اُن کے مقتدی ہوں، جناب نواز شریف صاحب بادشاہی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیں اور مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب ان کے سامع ہوں اور جناب عمران خان صاحب فیصل مسجد کے امام ہوں اور مولانا فضل الرحمٰن ان کے مقتدی تو کیا سین پارٹ ہو گا؟ اور پھر جہاں جناب الطاف بھائی کا خطبہ ہو گا اور جناب رحمان ملک کی تلاوت تو مقتدیوں کے پاس، کیا نماز قضا کرنے کے علاوہ بھی کوئی چارہ ہو گا؟ جناب عرض ہے کہ کیوں ایسی بے کار تجویزیں پیش کی جائیں کہ جن سے نماز جیسا اہم رکن دین ایک تماشہ بن کر رہ جائے۔ باقی اصلاح ہر طبقے کی ہونی چاہیے، اس سے کس کو انکار ہے؟ لیکن جس طرح سیاست دانوں کی اصلاح کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں ڈاڑھی والے بھرتی کر لیے جائیں، اسی طرح مولویوں کی اصلاح کا یہ کوئی طریقہ کار نہیں ہے کہ منبر و محراب پر سیاست دانوں کو بٹھا دیا جائے۔ "لکل فن رجال"، ہر فن کے اپنے لوگ ہوتے ہیں جو اسے بہتر جانتے ہیں اور بہتر طور چلانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں لہٰذا رجال کی اصلاح کی خواہش کا اظہار ان کی تربیت کا کوئی نظام قائم تجویز کر کے ہونی چاہیے، نہ کہ اکھاڑ پچھاڑ کے رستے۔

⑲ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"قانون نافذ کرنے والے ادارے اصلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ادارے ہوں گے۔ چنانچہ معاشرے میں سے صالح ترین افراد اِن اداروں کے لئے کارکنوں کی حیثیت سے منتخب کئے جائیں گے۔ وہ لوگوں کو بھلائی کی تلقین کریں گے اور ان سب چیزوں سے روکیں گے جنھیں انسان ہمیشہ سے برائی سمجھتا رہا ہے۔ تاہم قانون کی طاقت اسی وقت استعمال کریں گے، جب کوئی شخص کسی کی حق تلفی کرے گا یا اس کی جان و مال یا آبرو کے خلاف کسی اقدام

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث

© rasailojaraid.com
magazine.mohaddis.com

کے درپے ہو گا۔''

غامدی صاحب کا کہنا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کریں اور اس مقصد کے لیے باقاعدہ صالح ترین افراد کا انتخاب کیا جائے۔ لیکن قانون کی طاقت استعمال کرنے کی صورتوں میں یہاں بھی ہم وہی اضافہ کریں گے جو پیچھے کر چکے ہیں کہ اُس صورت میں بھی یہ ادارے قانون کی طاقت استعمال کریں گے کہ جس سے معاشرے میں کسی بھی قسم کے فتنہ یا فساد کے پھیل جانے کا اندیشہ ہو۔ نیز معروف و منکر کے تعین، میں انسانی عقل و دانش کے ساتھ میزان کی حیثیت قرآن و سنت کو حاصل ہو گی، جسے وہ منکر قرار دیں، اس کی روک تھام کی جائے اور جسے معروف کہیں اس کا بول بالا کیا جائے۔

⑳ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''قتل اور فساد فی الارض کے سوا موت کی سزا کسی جرم میں بھی نہیں دی جائے گی۔ نیز ریاست کا کوئی مسلمان شہری اگر زنا، چوری، قتل، فساد فی الارض اور قذف کا ارتکاب کرے گا اور عدالت مطمئن ہو جائے گی کہ اپنے ذاتی، خاندانی اور معاشرتی حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے تو اس پر وہ سزائیں نافذ کی جائیں گی جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت کو پورے شعور اور شرحِ صدر کے ساتھ قبول کر لینے کے بعد ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کیلیے اپنی کتاب میں مقرر کر دی ہیں۔''

غامدی صاحب کی یہ بات درست ہے کہ قتل اور فساد فی الارض میں موت کی سزا دی جائے لیکن اس کے علاوہ بھی بعض جرائم ایسے ہیں کہ جن کی سزا شریعتِ اسلامیہ میں موت مقرر کی گئی ہے جیسا کہ شادی شدہ مرد یا عورت اگر زنا کا ارتکاب کریں اور ان کا یہ جرم ثابت ہو جائے تو اس کی سزا بھی رجم ہے۔ اسی طرح غامدی صاحب کی طرف سے زنا، چوری، قتل اور قذف کے جرائم میں بیان کردہ قرآنی سزاوں کے نفاذ کی بات درست ہے۔ بس ان جرائم میں اللہ کے رسول ﷺ نے ایک اور جرم کا اضافہ فرمایا اور وہ شراب نوشی ہے۔ شراب نوشی کی صورت میں بھی چالیس یا اَسّی کوڑوں کی سزا جاری کی جائے گی جیسا کہ دونوں طرح کی روایات موجود ہیں۔ اور مجرم کے جرم پر اصرار اور اس جرم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فساد کی نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے جج ان دونوں میں سے کوئی بھی سزا نافذ کر سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com
مجلس تحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام ملت اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ محدث